حفیظ ہوشیار پوری

حفیظ کو مَیں نے سب سے پہلے اس وقت دیکھا جب وہ طالب علم تھے اور ایف سی کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج کے مشاعروں میں شرکت کرتے اور اپنا کلام سُناتے اور اس وقت کے تمام اساتذہ سے داد پاتے اور مَیں نے اس زمانے کے اساتذہ کو ان کے بارے میں یہ کہتے سُنا تھا کہ بڑے بڑے شاعروں کی اس عمر میں، جس میں حفیظ ہیں، یہ اُٹھان نہیں تھی۔ آگے دیکھیے یہ نوجوان کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ پھر حفیظ سے مرزا بیضاں خاں مروی ایرانی اور اختر شیرانی کے توسّل سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ حفیظ سب میں مل کر بھی سب سے الگ تھلگ رہتا۔ وہ فطرتاً تنہائی پسند تھا۔ پھر میری اور حفیظ کی ملاقاتوں میں کوئی پندرہ برس کا وقفہ حائل ہو گیا۔ اس کے بعد مَیں نے حفیظ کو اس وقت دیکھا جب مَیں ریڈیو پاکستان، کراچی میں ملازم ہوا اور حفیظ کا لاہور سے کراچی تبادلہ ہو گیا اور وہ اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر ہو کر کراچی آیا۔ اور جب مَیں نے حفیظ کو اتنی مُدّت گزرنے کے بعد دیکھا تو یوں معلوم ہوا کہ جیسے وہ ڈیپ فریزر سے نکل کر آیا ہے، ویسے کا ویسا تھا جیسے مَیں نے پندرہ برس پہلے دیکھا تھا بلکہ یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہو گا کہ جب وہ مرا تو اُس وقت بھی وہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ بوٹا سا قد، دُبلا پتلا، قاق کا قاق، گندمی رنگ، روشن آنکھیں، داڑھی مونچھ صفاچٹ، بش شرٹ اور پتلون پہنتا تھا جن پر کوئی کریز نہیں ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اُس نے مٹکے میں سے نکال کر انہیں پہنا ہے۔ ہاتھ میں بریف کیس، جسے وہ بہت سنبھال کر رکھتا۔ اس میں کچھ بکھرے ہوئے کاغذ اور کچھ مسوّدے ہوتے اور ایک آدھ تذکرہ بھی ہوتا۔ جب اور جہاں موقع ملتا کوئی کتاب نکال کر پڑھنے لگتا۔ لکھتا تو یوں لگتا کہ جیسے وہ اپنے قلم کو کاغذ میں گاڑھ کر اس پر اُلٹا کھڑا ہو جائے گا۔ حروف موٹے موٹے، کھلے کھلے اور الگ الگ ہوتے۔ لنچ کے وقت کینٹین سے ایک ٹوسٹ منگاتا اور انڈے کے آملیٹ سے اس طرح کھاتا کہ جیسے کھا نہیں رہا بلکہ

کھانے کے نام پر خانہ پُری کر رہا ہے۔

حفیظ اپنے ماتحتوں کے عیب پکڑتا۔ تعریف کرنا تو وہ جانتا ہی نہ تھا۔ خوشامد اور خوشامدیوں سے دُور رہتا۔ اچھی غزل یا اچھے شعر پر داد دیتا اور بُرے شعر پر ناک سکیڑ لیتا، جیسے اُسے شعر میں سے بُو آ رہی ہے۔ جب بھی وقت ملتا تو وہ کتابیں بیچنے والے کباڑیوں کی دکانوں پر پہنچ جاتا۔ اُسے دیکھتے ہی کباڑی سنبھل کر بیٹھ جاتے۔ پُرانی کتابوں کے معاملے میں یہ کباڑیوں کو غچہ دے جاتا۔ اِدھر اُدھر کی کتابوں کا سودا کرتا اور جو کتاب خریدنا مقصود ہوتی وہ اسے دو تین بار دیکھ کر چھوڑ دیتا اور آخر میں اسی کتاب کے دام پوچھتا، دکاندار کم قیمت بتاتا اور وہ یہ کتاب خرید لیتا اور کباڑی اُس کا مُنہ دیکھتا رہ جاتا۔ پُرانی کتابوں کے کباڑیوں کے یہاں اس کے ساتھ اکثر پیر حسام الدین راشدی۔ قاضی احمد میاں اختر اور ممتاز حسن بھی آیا جایا کرتے تھے اور وہ اپنے مطلب کی کتابیں ڈھونڈھ نکالتے اور پھر ان کا سودا حفیظ سے کرواتے۔ حفیظ کی نظر میں شہر کے سارے کباڑی تھے۔ کچھ کباڑی ایسے بھی تھے جہاں وہ کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے جایا کرتا تھا۔ مجھے بھی حفیظ کے ساتھ اُن دکانوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ دو دو چار چار گھنٹے تک ان پُرانی کتابوں میں ایسا کھو جاتا کہ خود بھی انہیں میں سے معلوم ہوتا۔ گھر آتا گرد میں اٹا ہوا۔ نہ جانے کتنے کتابوں کے جراثیم وہ اپنے ساتھ لے آتا اور جس مَرض میں حفیظ کا انتقال ہوا، مَیں تو یہ کہوں گا کہ وہ انہیں کتابی کیڑوں سے پیدا ہوا ہوگا۔

حفیظ بڑا دُکھی انسان تھا۔ دُکھ اس کے اپنے نہیں تھے، پوری انسانیت اور پوری کائنات کے تھے۔ اتنی مدت جو وہ جی لیا تو سمجھو بہت ہی جی لیا۔ وہ ہنستا بھی تھا اور ہنساتا بھی تھا لیکن اُوپر کے دل سے۔ غزل کہتا تو اپنے قد و قامت جیسی چھوٹی بحر میں [آسان لفظ لیکن اونچا خیال] کئی رنگ اور باتیں دل میں اُتر جانے والی۔ وہ تاریخ نکالنے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ آپ کے مُنہ سے مصرع نکلا اور اس نے حروف جوڑ کر بتایا کہ اس مصرع سے فلاں سال نکلتا ہے۔ قاضی احمد میاں اختر نے اپنے بیٹے کے بارے میں یہ کہا کہ یہ پیدائشی مختون ہے۔ حفیظ نے قلم اٹھایا اور کاغذ پر یہ لکھ دیا: ''قاضی صاحب کے پسرِ مختون'' ......اور تاریخ نکل آئی۔

قاضی صاحب کے گھر ہم سب جمعہ کے دن جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے کہا کہ اگلے جمعے میرے یہاں کھانا کھایئے، میری بیوی برابر تقاضے کر رہی ہے۔ حفیظ

نے قلم اُٹھایا اور ایک کاغذ پر یہ لکھ دیا: ''بیوی کے تقاضے''.....اور مادہ تاریخ نکل آیا۔

طالب علمی کے زمانے ہی میں حفیظ شعر کہنے لگا تھا۔ وہ اپنے ہم عمر شاعروں سے اچھے شعر کہتا، بلکہ اس زمانے کے اساتذہ اور چوٹی کے شعراء کی بھی ہمسری کرتا۔

آج سے تقریباً چالیس برس اُدھر کی بات ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک مشاعرہ ہوا۔ صدر اس مشاعرے کے سید احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم تھے۔ شعراء میں، نشتر جالندھری، احسان دانش، مرزا بیضا خان مروی ایرانی، صوفی تبسم، ڈاکٹر تاثیر اور نوعمروں میں سراج الدین ظفر تھے اور احمد ندیم قاسمی ایک طالب علم اسی کالج کا نوعمر، سر کے بال سفید، دُبلا پتلا، گندمی رنگ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، بوٹا سا قد، اپنے قد کی برابر کی بحر میں ایک غزل سُنا کر اور مشاعرہ لوٹ کر چلا گیا۔ یہ عمر اور ایسے بانکے، سُتھرے اور البیلے اشعار۔ یہ عمر اور یہ مذاق۔ ایسی سنجیدگی، ایسی پختگی اور خیالات میں ایسی گہرائی۔ آپ بھی اس نوجوان شاعر کی یہ غزل سنیے۔

کوئی ستم آشنا نہیں ہے جینے کا کوئی مزا نہیں ہے

بے لطف ہے اپنی زندگانی اب ہم سے کوئی خفا نہیں ہے

ہر قلب غم آشنا ہے لیکن ہر غم غم آشنا نہیں ہے

اُمید وفا پہ جینے والو! اُمید وفا، وفا نہیں ہے

ملتے نہیں کیوں حفیظ سے آپ ایسا تو وہ بُرا نہیں ہے

جب حفیظ ہوشیار پوری اپنی غزل سُنا چکے تو صدرِ مشاعرہ پطرس بخاری نے یوں داد دی

انگل بھر کی زباں اور یہ گُل کاریاں

اس پر ایک سردار جی نے آواز لگائی:

گنڈیریاں ہی گنڈیریاں

جب حفیظ کی اس غزل کا چرچا ہوا تو ایک صاحب حفیظ کی تلاش میں حفیظ کے ہوسٹل کے کمرے پر پہنچے اور انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ یہ ایک لمبے قد کے منحنی سے آدمی تھے۔ مَیلے کچیلے کپڑے۔ بس اسی میلے پن سے وہ لاکھوں میں پہچانے جاتے تھے۔ یہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بھائی مرزا نسیم بیگ چغتائی تھے۔ بچّوں کے لیے انہوں نے بہت سا نثری و شعری سرمایا چھوڑا ہے۔ غزل کے شاعر تھے۔ بہت کم شعر کہتے، لیکن جو کہتے خوب کہتے۔ مجھے اس وقت ان کا

ایک مصرع یاد آ گیا۔ ذرا تیور ملاحظہ فرمایئے۔

تو کیا ارادہ ہے مَر کر دکھا دیا جائے؟

غرض فہیم بیگ چغتائی نے حفیظ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ لڑکے چل میرے ساتھ، حفیظ بھی چل کھڑے ہوئے۔ مرزا صاحب ایک چنگڑ محلّے میں رہتے تھے۔ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ اُن کی رہائش ایک کوٹھری میں تھی اور کوٹھری بھی ایسی جیسے خود مرزا صاحب۔ مکڑیوں کے جالے ہر طرف تنے ہوئے۔ زمین پر بوریا بچھا ہوا۔ کونے میں ایک کھاٹ۔ ایک طرف مٹکا، مٹکے کے اوپر مٹی کا ایک پیالہ، جس پر کائی جمی ہوئی تھی۔ مرزا صاحب حفیظ صاحب کو اس کمرے میں بند کر کے اور باہر سے تالا ڈال کر چل دیئے۔ حفیظ حیران کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ شام کو مرزا صاحب تشریف لائے، دروازہ کھولا۔ نہ مزاج پوچھا نہ معافی مانگی، تھانے کی طرح حفیظ کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

''صاحب زادے! سچ سچ بتاؤ کہ وہ غزل جو تم نے گورنمنٹ کالج کے مشاعرے میں پڑھی تھی، کس سے لکھوائی تھی؟''

حفیظ نے کہا: ''یہ غزل مَیں نے کہی تھی۔''

مرزا صاحب نے کہا: ''لیکن لکھی کس نے تھی؟''

حفیظ نے کہا: ''مَیں غزل کہتا ہوں، لکھتا نہیں ہوں۔''

حفیظ کا پیاس کے مارے بُرا حال تھا۔ اُس نے مٹکے سے پانی نکالا۔ کچھ پیا، کچھ بہہ گیا۔ حفیظ نے فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

بپاسِ مہماں وہ خم لنڈھائے تُو نے اے ساقی
کہ موجِ بوریا بھی موجِ دریا ہوتی جاتی ہے

مرزا صاحب کا مُنہ کھلا کا کھلا اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہوں نے حفیظ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''کیوں میاں لڑکے! تم یہ جانتے ہو کہ موجِ بوریا کسے کہتے ہیں؟''

حفیظ نے کہا: ''اس لکیر کو جو بوریے پہ پڑی ہوتی ہے۔''

مرزا صاحب نے حفیظ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا: ''یہ غزل واقعی تم نے کہی ہوگی۔''

پوچھا: ''تمہارے ساتھ اور کون سے شاعر طالب علم پڑھتے ہیں؟''

حفیظ نے ڈاکٹر یاور عباس، یاور دہلوی اور سراج الدین ظفر کے نام بتائے۔

مرزا صاحب نے کہا: ''تم ظفر کو اچھی طرح جانتے ہو؟'' کہا ''خوب جانتا ہوں۔''
فرمایا: ''اب جو تمہاری اس سے ملاقات ہو تو اُسے میرا یہ شعر سُنا دینا:

کبھی جن راہوں میں اے بے وفا تو ساتھ ہوتا تھا
ترا دیوانہ اب ان راہوں سے تنہا گزرتا ہے

حفیظ اچھے شاعر تو تھے ہی، نثر بھی خوب لکھتے تھے۔ان کے کتب خانے میں بے شمار کتابیں تھیں۔قلمی نسخے بھی اور ایسی کتابیں بھی تھیں جو اب نایاب ہیں۔وہ محقق تھے۔تاریخ نکالنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔کوئی فی البدیہہ شعر کہتا اور یہ فی البدیہہ تاریخ نکالتے تھے۔ میرا اور حفیظ کا ساتھ بیس پچیس برس رہا ہے۔وہ بڑے منکسر المزاج انسان تھے۔تصنع ان میں نام کو نہ تھا۔ریڈیو پاکستان سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ ایک ایسے مرض میں مبتلا ہوئے جو بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔مزے کی بات تو یہ کہ اس مرض کی تشخیص کے سلسلے میں انہوں ہسپتال میں رہ کر بے شمار کتابیں پڑھ ڈالیں۔جب بھی ان سے ہسپتال میں ملنے جاتا تو وہ مجھے اپنا مرض خاکہ پر کھینچ کر سمجھاتے اور کہتے۔دیکھو کیسا عجیب مرض ہے۔پھر یہ بھی بتاتے کہ کون کون سے لوگ کس کس ملک میں اس مرض میں مرے ہیں۔وہ ایک مرتبہ چوہدری اقبال کو اس مرض کی تاریخ سُنا رہے تھے اور چونکہ چوہدری صاحب ان کے بہت بے تکلف دوست تھے،حفیظ سے کہنے لگے:

''کم بخت،اب تو اس مرض کا تاریخ اور جغرافیہ چھوڑ اور قاعدے میں اپنا علاج کرا اور یہ سارا معاملہ ڈاکٹروں پر چھوڑ دے۔مر رہا ہے لیکن اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔''

جب مرض نے حفیظ پر قابو پا لیا اور حفیظ اپنی موت کے دن گننے لگا تو اس کا یہ عالم دیکھا نہیں جاتا تھا۔موت سے کچھ دن پہلے حفیظ نے کہا تھا۔

اس وقت کہاں سے آ گئے تم
اس وقت مَیں اپنے رُو بڑو ہُوں

اور جب مَرنے والے کی اس دُنیا میں چند سانسیں باقی رہ گئی ہوں تو اس کی حالت کی یہ کیسی اچھی تصویر ہے۔شعر سُنیے۔یہ حفیظ کا آخری شعر تھا۔

سَر بسَر اک غبار چھایا ہے
رہ گُزر سے نشانِ منزل تک

☆☆☆

حفیظ ہوشیار پوری: ولادت: ۵ جنوری ۱۹۱۲ء۔ وفات: ۱۰ جنوری ۱۹۷۳

اللہ بخش حفیظ ہوشیار پوری نے نہایت باغ و بہار طبیعت پائی تھی۔ انتظار حسین اپنی خودنوشت 'چراغوں کا دھواں' میں لکھتے ہیں:

''حفیظ صاحب کے اعداد ان کے بہت کہنے میں تھے۔ بس آپ نے منہ سے فقرہ نکلا اور حفیظ صاحب نے فقرہ پکڑا اور لہک کر بولے 'لو تاریخ نکل آئی'۔ بیٹھے بیٹھے یہی کرتے رہتے تھے۔ بات کرتے کرتے کوئی مصرعہ پڑھا، تڑپ کر بولے 'ارے یہ تو تاریخ نکل آئی'۔ دوسرے کی زبان سے کوئی فقرہ نکلا، فقرے کو چٹکی سے پکڑا اور جھٹ سے اس سے تاریخ برآمد کردی۔ ذکر ہو رہا تھا کہ ناصر [ناصر کاظمی] کی شادی ہوگئی، اب وہ پابند ہوگیا ہے۔ پابند کے لفظ کو پکڑ لیا۔ بولے 'شادی کی تاریخ نکل آئی۔ پابند ناصر کاظمی'۔
جس ذوق شوق سے تاریخ نکالتے تھے اسی ذوق شوق سے یاروں کی ہجویں کہتے تھے۔ کسی بھی دوست پر کسی بھی موقع پر رواں ہو جاتے۔ پھر چل سو چل۔ شیخ صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ باتیں علم و فضل کی ہو رہی تھیں۔ مگر ایک دفعہ جو پٹری بدلی تو بس چل نکلے۔

آ شیخ صلاح الدین
جا شیخ صلاح الدین
پنجابی میں وہ بولا
پا شیخ صلاح الدین

میں نے کہیں پیچھے ذکر کیا ہے کہ شیر محمد اختر اور رضی اختر نے مل کر کتابوں کی دکان کھولی تھی۔ دکان کا نام رکھا 'اختر اور اختر'۔ حفیظ صاحب کو نام پڑھ کر گدگدی ہوئی۔ اور ہجو لکھ ڈالی۔ سن لیجیے۔

رضی سے جب یہ پوچھا شغل کیا ہے

وہ بولے جی کتابیں بیچتے ہیں
ہے ان کی دکان کا نام اختر اور اختر
یہ دو پاجی کتابیں بیچتے ہیں
خریدوں نہ میں ان سے کتابیں
بہت مہنگی کتابیں بیچتے ہیں
ہے ان میں ایک عاشق ایک معشوق
فقط جنسی کتابیں بیچتے ہیں

ریڈیو کے دوستوں سے سنا کہ جب شوکت تھانوی نے دوسری شادی کی تو ان کے بڑے صاحب زادے غصے سے بھرے ریڈیو اسٹیشن پہنچے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا 'ابا جی، اگر یہ خرمستی'............بس اتنا ہی کہا تھا کہ حفیظ صاحب، جو اس مبارک گھڑی میں وہاں موجود تھے، اچھل پڑے اور بولے 'بس بس۔ تاریخ ہوگئی۔ ابا جان خرمستی سے شادی کی تاریخ نکلتی ہے۔'

□□□